ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3953

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: مطالعہ قرآن حکیم ترجمہ تفسیر (3953) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 ریونٹ نمبر 6 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: نکاح، طلاق اور عدت کے احکام کا خلاصہ اور خاندانی نظام کا استحکام (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ نکاح، طلاق اور عدت کے احکام کا خلاصہ بیان کریں اور خاندانی نظام کے استحکام میں ان کی اہمیت واضح کریں۔ (20)

تعارف

خاندان انسانی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے، اور اسی اکائی کے استحکام پر پوری تہذیب کا استحکام منحصر ہے۔ قرآن حکیم نے خاندانی زندگی کو اتفاقی یا وقتی بندھن نہیں سمجھا بلکہ اسے باقاعدہ احکام کے ذریعے منظم کیا ہے، جن میں نکاح، طلاق اور عدت کے احکام مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ سورۃ النساء، سورۃ البقرہ، سورۃ الطلاق اور سورۃ النور وغیرہ میں ان ابواب کی تفصیلات آئی ہیں جن کا مقصد گھر کو محبت، عدل اور سکون کا گہوارہ بنانا ہے۔ نکاح سے خاندان وجود میں آتا ہے، طلاق بطورِ ناگزیر علاج آخری راستے کے طور پر رکھا گیا ہے، اور عدت جدائی کے بعد کے دور میں حقوق کی حفاظت اور سوچنے کی مہلت کا نظام ہے۔ ان تینوں احکام کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے خاندان کو جذباتی فیصلوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا بلکہ ہر مرحلے کے لیے ضابطہ دیا ہے۔ اس جواب میں پہلے تینوں احکام کا خلاصہ، پھر ان کی حکمتیں اور آخر میں خاندانی استحکام میں ان کا کردار بیان کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ کسی مخصوص کیس میں شرعی رائے کا حق مستند علماء اور عدالتوں کو حاصل ہے، یہ تحریر تعلیمی مقصد کے اصول کو بیان کرنے تک محدود ہے۔

نکاح کے احکام کا خلاصہ

نکاح ایک پختہ معاہدہ (میثاقِ غلیظ) ہے جس کے ذریعے مرد و عورت شرعی شرائط کے ساتھ میاں بیوی کے رشتے میں بندھتے ہیں۔ سورۃ النساء (آیت 21) میں اسے پختہ عہد کہا گیا ہے اور سورۃ الروم (آیت 21) کے مفہوم میں میاں بیوی کے درمیان سکون، محبت اور رحمت کو اللہ کی نشانیوں میں سے قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی نکاح کے نمایاں ارکان و شرائط میں ایجاب و قبول، گواہوں کی موجودگی، ولی کی سرپرستی (فقہی تفصیل کے ساتھ)، مہر کا تعین اور ممنوعہ رشتوں (محرمات) کا لحاظ شامل ہے۔ مہر عورت کا حق ہے جو عزت و ذمہ داری کی علامت کے طور پر ادا کیا جاتا ہے (سورۃ النساء، آیت 4 کا مفہوم)۔ نکاح کے مقاصد میں عفت و پاکدامنی، نسلِ انسانی کا تحفظ، باہمی سکون و محبت اور رشتے داریوں کے ذریعے معاشرتی نسیج کو وسیع کرنا شامل ہیں۔ اسلام نے رہبانیت یعنی شادی سے کلی گریز کو پسند نہیں کیا بلکہ نکاح کو انسانی فطرت کے تقاضے کو جائز و پاکیزہ قالب دینے کا ذریعہ بنایا ہے، کیونکہ جذبات کو دبانے کے بجائے منظم کرنا ہی پائیدار تمدن کی بنیاد ہے۔

طلاق کے احکام کا خلاصہ

طلاق نکاح کے اس مقدس بندھن کو شرعی طریقے سے ختم کرنے کا نام ہے۔ اسلام نے طلاق کو پسند نہیں کیا مگر جب زندگی باہم نبھانا ناممکن ہو جائے تو ظلم و تشدد یا چھپی ہوئی نفرت میں زندگی گزارنے کے بجائے باعزت علیحدگی کا راستہ کھولا ہے۔ سورۃ البقرہ (آیات 229 تا 232) اور سورۃ الطلاق میں اس کی تفصیلات آئی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ طلاق تدریجی مراحل رکھتی ہے، طہر (حیض سے پاکی) کی حالت میں دی جائے، غصے اور فوری جذبات میں فیصلہ نہ کیا جائے، درمیان میں رجوع کا موقع باقی رہے، خاندانوں کے ثالثوں (حکم) کے ذریعے صلح کی کوشش ہو (سورۃ النساء، آیت 35 کا مفہوم) اور علیحدگی بھی ہو تو معروف اور احسن طریقے سے ہو، عورت کے حقوق مثلاً مہر، عدت کے اخراجات اور متاع کی ادائیگی میں کمی نہ ہو۔ بعض صورتوں میں عورت کی طرف سے خلع کا راستہ بھی شریعت نے رکھا ہے اور عدالت کو بھی مخصوص حالات میں مداخلت کا اختیار حاصل ہے، جن کی جزئیات فقہ کی کتابوں میں ہیں۔ اس خاکے سے واضح ہوتا ہے کہ طلاق اسلام میں حیل نہیں بلکہ آخری چارہ ہے جس کے گرد صلح، سوچ بچار اور حقوق کی حفاظت کی دیواریں کھڑی کی گئی ہیں۔

عدت کے احکام کا خلاصہ

عدت اس مقررہ مدت کا نام ہے جو عورت کو طلاق یا شوہر کی وفات کے بعد گزارنی ہوتی ہے جس میں وہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ سورۃ البقرہ (آیت 228) کے مفہوم میں طلاق یافتہ عورتوں کی عدت تین حیض (قروٗ) بیان ہوئی ہے، سورۃ الطلاق (آیت 4) میں حمل والی کی عدت وضعِ حمل تک اور جنہیں حیض نہ آتا ہو ان کے لیے الگ مدت کا مفہوم آیا ہے، جبکہ بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن بیان ہوئی ہے (سورۃ البقرہ، آیت 234 کا مفہوم)۔ اس کے علاوہ جس عورت کو رخصتی سے پہلے طلاق ہو جائے اس پر کوئی عدت نہیں (سورۃ الاحزاب، آیت 49 کا مفہوم)۔ عدت کی حکمتیں متعدد ہیں: حمل کی صورت کا واضح ہو جانا تاکہ نسب میں اختلاط نہ ہو، میاں بیوی کو رجوع و صلح پر غور کا موقع ملنا، شوہر کی وفات کی صورت میں سوگ و احترام کا اظہار اور نئے رشتے کی نفسیاتی تیاری شامل ہیں۔ عدت کے دوران عورت کے نان نفقے اور رہائش کا بندوبست بھی شرعی اصولوں میں شامل ہے جیسا کہ سورۃ الطلاق کے آغاز میں اس کی طرف اشارے ملتے ہیں، تاکہ یہ عرصہ عورت کے لیے معاشی بے چینی کا دور نہ بنے۔

جدول 1: نکاح، طلاق اور عدت — احکام و حکمتیں ایک نظر میں

باب	بنیادی اصول	خاندانی حکمت
نکاح	ایجاب و قبول، گواہ، مہر، محرمات کا لحاظ	محبت و سکون پر مبنی مستقل گھر کی بنیاد
طلاق	مرحلہ وار عمل، ثالثی، حقوق کی ادائیگی	ناگزیر علیحدگی کا باعزت و پرامن راستہ
عدت	مقررہ مدت میں دوسرے نکاح کی ممانعت	نسب کی حفاظت، سوچنے کی مہلت اور حقوق کا تحفظ

خاندانی استحکام میں ان احکام کی اہمیت (1)

ان احکام کی اہمیت کا پہلا پہلو یہ ہے کہ نکاح نے خاندان کو ایک مقدس و قانونی بنیاد دی۔ جب رشتہ محض وقتی جذبے کے بجائے گواہوں، ولی اور معاہدے سے قائم ہو تو دونوں فریق ذمہ داری محسوس کرتے ہیں، عورت کو تحفظ و حقِ مہر ملتا ہے، بچوں کو جائز شناخت اور وراثت کا حق ملتا ہے اور پورے معاشرے کو پتا ہوتا ہے کہ کس کا کس سے تعلق ہے۔ اس قانونی شفافیت ہی سے نسب، وراثت، کفالت اور عزت کے بے شمار مسائل حل ہوتے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ طلاق کے تدریجی و ضابطہ بند نظام نے گھر ٹوٹنے کی رفتار کو سست کر دیا۔ غصے کے وقتی فیصلے کو مرحلہ وار عمل، ثالثوں کی مداخلت اور رجوع کی مہلت جیسے وقفوں سے گزارنا بہت سے گھروں کو بچا لیتا ہے، کیونکہ زیادہ تر جھگڑے مستقل نہیں ہوتے، عارضی جذباتی طوفان ہوتے ہیں۔ شریعت کا یہ اسلوب جدید خاندانی مشاورت (فیملی کونسلنگ) کے اصول سے حیرت انگیز طور پر ہم آہنگ ہے کہ فیصلے سے پہلے مصالحت کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

خاندانی استحکام میں ان احکام کی اہمیت (2)

تیسرا پہلو یہ ہے کہ عدت نے خاندانی انتشار کے بعد پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو روک دیا: نسب کا اختلاط ختم ہوا، بچوں کے حقوق واضح رہے، عورت کو جذباتی فیصلوں میں جلدی کے بجائے وقفہ ملا اور حکومت و عدالت کے لیے ریکارڈ صاف رہا۔ چوتھا پہلو حقوق کا توازن ہے کہ ان احکام نے نہ مرد کو بے لگام اختیار دیا اور نہ عورت کو بے سہارا چھوڑا؛ مرد پر

نان نفقہ و حسنِ سلوک کی ذمہ داری ہے، عورت کے لیے مہر، عدت کے حقوق اور ضرورت پڑنے پر خلع و عدالتی چارہ جوئی کے دروازے کھلے ہیں۔ پانچواں پہلو اخلاقی بنیاد ہے کہ پورا نظام محبت و رحمت کے گرد گھومتا ہے، یعنی قانون کا مقصد سزا نہیں بلکہ گھر کی حفاظت ہے، حتیٰ کہ علیحدگی بھی احسان کے ساتھ کرنے کا حکم ہے (سورۃ البقرہ، آیت 229 کے مفہوم میں امساک بمعروف یا تسریح بمعروف)۔ جس معاشرے میں یہ احکام تعلیم و آگاہی کے ساتھ نافذ ہوں وہاں گھروں میں استحکام، بچوں کی تربیت میں تسلسل اور بزرگوں کی دیکھ بھال کی روایت مضبوط رہتی ہے، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو سماجی صحت کی اصل علامتیں ہیں۔

عصرِ حاضر کے مسائل اور قرآنی رہنمائی

آج خاندانی نظام جن خطرات سے دوچار ہے ان میں طلاق کی بڑھتی شرح، گھریلو تشدد، مواصلات کی کمی، معاشی دباؤ اور مشترکہ خاندانی نظام کا بکھراؤ نمایاں ہیں۔ قرآنی احکام کا مطالعہ ان مسائل کا یہ حل پیش کرتا ہے کہ نکاح سے پہلے رشتے کی شرعی و اخلاقی تربیت دی جائے، جھگڑے میں قرآنی ثالثی کے نظام کو زندہ کیا جائے، یعنی دونوں خاندانوں کے بااثر و منصف افراد مصالحت کرائیں، طلاق کو سوشل میڈیا و عوامی الزام تراشی کے بجائے ضابطے اور وقار سے طے کیا جائے، اور بچوں کے حقوق کو والدین کے اختلافات سے الگ رکھا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان موضوعات پر رائے دیتے وقت جذبات کے بجائے علم کا سہارا لیا جائے اور مشکل کیسز کو علماء و قانونی ماہرین کے سامنے رکھا جائے، کیونکہ اجمالی رائے سے گھروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ریاست کی سطح پر نکاح و طلاق کا باقاعدہ اندراج، ثالثی کونسلز کا فعال ہونا اور عورت و بچے کے حقوق کی بروقت فراہمی اسی قرآنی نظام کی جدید انتظامی صورتیں ہیں۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ نکاح، طلاق اور عدت کے احکام آپس میں جڑا ہوا ایک مکمل خاندانی نظام بناتے ہیں: نکاح محبت و ذمہ داری سے گھر بناتا ہے، طلاق ناگزیر صورت میں باعزت رخصتی کا منظم راستہ دیتا ہے، اور عدت اس تمام عمل کو نسب، حقوق اور سوچ بچار کے تحفظ سے مکمل کرتی ہے۔ ان کی اہمیت صرف قانونی نہیں بلکہ اخلاقی و نفسیاتی بھی ہے، کیونکہ یہ احکام گھر کو کشمکش کے میدان کے بجائے سکون گاہ بناتے ہیں۔ جو طالب علم ان احکام کو محض فقہی مسائل سمجھ کر پڑھتا ہے وہ ان کی حکمت سے محروم رہتا ہے، اور جو

انہیں خاندان کی حفاظت کے خدائی منصوبے کے طور پر سمجھتا ہے وہ اپنی عملی زندگی میں بھی انصاف، صبر اور احسان کا پیکر بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے گھروں کو اسی قرآنی روشنی سے منور فرمائے۔

سوال نمبر 2. حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا، قبولیت اور حاصل ہونے والے اسباق (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور قبولیتِ دعا کے واقعے سے حاصل ہونے والے اسباق پر گفتگو کریں۔ (20)

تعارف

حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے جلیل القدر نبی ہیں جن کا ذکر قرآن حکیم میں سورۃ آلِ عمران، سورۃ مریم، سورۃ الانبیاء اور سورۃ الانعام سمیت متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ان کی دعا اور اس کی قبولیت کا واقعہ قرآن کے ان مقامات میں سے ہے جہاں دعا کی روح، بندے کی عاجزی اور اللہ کی قدرت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ پن کے باوجود اولاد کی دعا کرنا، پھر فرشتوں کے ذریعے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خوشخبری ملنا اور تین دن اشارے کے سوا گفتگو نہ کرنے کی نشانی کا واقعہ ہر دعا کرنے والے کے لیے راہ نما ہے (سورۃ آلِ عمران، آیات 38 تا 41 اور سورۃ مریم، آیات 2 تا 15 کا مفہوم)۔ یہ واقعہ اس یقین کی تربیت کرتا ہے کہ اسباب کی ظاہری بندش اللہ کی قدرت کی بندش نہیں ہوتی۔ اس جواب میں پہلے واقعے کا خلاصہ، پھر دعا کے آداب و اسبابِ قبولیت اور آخر میں اس سے حاصل ہونے والے اسباق تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔

واقعے کا پس منظر اور خلاصہ

پس منظر یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے کفیل و سرپرست تھے۔ جب وہ مریم علیہا السلام کے حجرے (محراب) میں جاتے تو ان کے پاس بے موسم رزق اور پھل پاتے، اور پوچھنے پر جواب ملتا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے (سورۃ آلِ عمران، آیت 37 کا مفہوم)۔ یہی مشاہدہ

زکریاعلیہ السلام کے دل میں دعا کی تحریک بن گیا کہ جس پروردگار نے بے موسم رزق دیا ہے وہ بے سبب اولاد بھی دے سکتا ہے۔ وہیں انہوں نے اپنے رب سے پکار کر دعا کی کہ اے میرے رب، مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو ہی دعا سننے والا ہے (آیت 38 کا مفہوم)۔ سورۃ مریم میں اس دعا کی مزید کیفیت بیان ہوئی ہے کہ سر کے بال بڑھاپے سے سفید ہو چکے ہیں، ہڈیاں کمزور ہیں، بیوی بانجھ ہے، اور دعا کا مقصد ذاتی خواہش سے بڑھ کر یہ تھا کہ دینی وراثت آگے چلتی رہے اور قرابت داروں (موالی) کے بارے میں فکر تھی۔ جواب میں فرشتوں نے خوشخبری دی کہ اللہ آپ کو یحییٰ نامی فرزند کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے کلمے کی تصدیق کرنے والا، سردار، پاکدامن اور صالح نبی ہو گا۔ زکریاعلیہ السلام نے نشانی مانگی تو تین دن اشارے کے سوا بات نہ کر سکنا نشانی قرار پایا، اور انہوں نے اس عرصے میں تسبیح و ذکر کی کثرت کی۔

دعا کے آداب جو اس واقعے سے ظاہر ہوتے ہیں

اس واقعے میں دعا کے کئی آداب چھپے ہیں۔ پہلا ادب خلوت و تنہائی ہے کہ زکریاعلیہ السلام نے محراب میں، دنیا کے شور سے الگ ہو کر دعا کی، اور سورۃ مریم نے اس پکار کو "خفیا" یعنی آہستہ و پوشیدہ پکار سے تعبیر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں نمائش کے بجائے دل کی حاضری مطلوب ہے۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ دعا میں اپنے ضعف کا اعتراف اور اللہ کی قدرت کا اقرار ساتھ ساتھ ہو، جیسا انہوں نے اپنے بڑھاپے کا ذکر بھی کیا اور رب کی سخاوت کا بھی۔ تیسرا ادب نیک مقصدیت ہے کہ ان کی دعا صرف ذاتی محرومی کی تکمیل نہیں تھی بلکہ دین کی خدمت کے لیے وارث کی طلب تھی، اور مقصد جتنا بڑا ہو دعا اتنی ہی قیمتی ہوتی ہے۔ چوتھا ادب یہ ہے کہ دعا سے پہلے نیکی کا ماحول تھا: وہ نبی تھے، مریم علیہا السلام کی خدمت و کفالت میں مصروف تھے، یعنی قبولیت کی بنیادیں زندگی کے اعمال سے تیار ہوتی ہیں۔ پانچواں ادب صبر و تسلسل ہے کہ عمر بھر کی خدمت کے بعد بھی دعا کی لگن باقی رہی، مایوسی کبھی قریب نہ آئی جس کا اعتراف انہوں نے خود ان الفاظ کے مفہوم میں کیا کہ وہ اپنے رب سے دعا کر کے کبھی محروم نہیں رہے۔

قبولیتِ دعا میں اللہ کی قدرت کا ظہور

اس واقعے کا مرکزی معجزاتی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بظاہر تمام اسباب منقطع ہونے کے باوجود دعا قبول فرمائی۔ عمر رسیدگی، جسمانی کمزوری اور زوجہ کا بانجھ ہونا طبی اعتبار سے اولاد کی راہ میں مکمل رکاوٹ تھی، مگر اللہ نے اپنے جواب کے مفہوم میں یہ بھی فرمایا کہ یہ میرے لیے آسان ہے، میں نے تمہیں بھی اس وقت پیدا کیا جب تم کچھ نہ تھے (سورۃ

مریم، آیت 9 کا مفہوم)۔ یہ جملہ دعا فلسفے کا خلاصہ ہے کہ دعا اسباب کو بے کار نہیں کرتی بلکہ اسباب کے خالق سے رجوع کا نام ہے۔ خوشخبری کے ساتھ فرزند کی صفات بھی بیان کی گئیں تا کہ معلوم ہو کہ اصل دولت اولاد کی تعداد نہیں بلکہ اس کی صلاحیت و صالحیت ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن ہی میں حکمت و کتاب کی سمجھ اور والدین سے حسنِ سلوک کی صفات عطا ہوئیں (سورۃ مریم، آیات 12 تا 14 کا مفہوم)۔ نشانی کے تین دن کی خاموشی بھی اس سبق کو گہرا کرتی ہے کہ قبولیت کے بعد بندے کا کام شکر، ذکر اور زبان کی حفاظت ہو جاتا ہے۔

حاصل ہونے والے اسباق (1): امید، یقین اور مایوسی سے بچاؤ

اس واقعے کا سب سے بڑا سبق امید ہے۔ قرآن نے مایوسی کو کافرانہ صفت قرار دیا ہے اور اللہ کی رحمت سے امید ہونے سے منع فرمایا ہے (سورۃ یوسف، آیت 87 اور سورۃ الزمر، آیت 53 کا مفہوم)۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر، حالات اور اسباب سب مایوسی کی دلیل بن سکتے تھے لیکن انہوں نے اسباب کو دیکھنے کے بجائے مسبب الاسباب کو دیکھا۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ قبولیت کی گھڑی اللہ کے علم میں متعین ہوتی ہے، بعض دعائیں دیر سے قبول ہوتی نظر آتی ہیں مگر اس تاخیر میں بھی حکمت ہوتی ہے، اس دوران بندے کا ایمان پختہ اور طلب مخلص ہو جاتی ہے۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ دوسروں پر اللہ کی نعمت دیکھ کر حسد کے بجائے دعا کی تحریک لینی چاہیے، جیسا کہ مریم علیہا السلام کے پاس رزق دیکھ کر زکریا علیہ السلام حسد کے بجائے اپنے لیے خیر کی دعا مانگنے لگے۔ یہ طرزِ فکر حسد جیسی مہلک بیماری کا بہترین علاج ہے کہ بندہ دوسرے کی نعمت کو اپنے لیے دعا کا محرک بنا لے۔

حاصل ہونے والے اسباق (2): اولاد کی اصل قدر اور دینی وراثت

چوتھا سبق یہ ہے کہ اولاد کی طلب کا بہترین مقصد نیکی کا تسلسل ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد اس لیے مانگی کہ علم و نبوت کا سلسلہ آگے بڑھے اور اقربا کے نامناسب رویوں سے دینی امانت محفوظ رہے، مال و جائیداد کی وارثی ان کے پیشِ نظر نہیں تھی۔ اس سے آج کے انسان کو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اولاد کی خواہش کو دنیاوی سہارے تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے صدقہ جاریہ بنانے کی نیت رکھی جائے۔ پانچواں سبق پاکیزہ اولاد کی صفت ہے، انہوں نے "ذریتِ طیبہ" یعنی پاکیزہ اولاد مانگی، جس سے معلوم ہوتا

ہے کہ دعا میں اولاد کی صحت و کثرت کے ساتھ اس کے ایمان و اخلاق کی بھی دعا کرنی چاہیے، کیونکہ صالح اولاد ہی دنیا و آخرت کی اصل کمائی ہے۔ چھٹا سبق یہ ہے کہ نعمت ملنے کے بعد اس کی قدر اور اس پر شکر لازم آتا ہے، جیسا کہ زکریا علیہ السلام نے تین دن ذکر و تسبیح میں گزار کر شکر کی عملی صورت اختیار کی۔ ساتواں سبق خدمتِ خلق و عبادت گاہ سے وابستگی کا ہے، کیونکہ یہ دعا محراب یعنی عبادت کے ماحول میں مانگی گئی تھی، جس سے پتا چلتا ہے کہ پاکیزہ ماحول و اعمال دعاؤں کی قبولیت کا پس منظر بنتے ہیں۔

موجودہ زندگی میں عملی رہنمائی

آج کے مصروف انسان کے لیے اس واقعے کی عملی شکل یہ ہے کہ وہ اپنی جائز حاجتوں کے لیے باقاعدہ تنہائی میں دعا کا اہتمام کرے، دعا میں اپنے ضعف کی سچی کیفیت اور اللہ کی رحمت کا یقین جمع کرے، اسباب اختیار کرنے میں کوتاہی نہ کرے مگر نتیجہ اسباب کے حوالے نہ کرے اور دوسروں کی خوشحالی کو دیکھ کر حسد کے بجائے اپنے حق میں دعا اور ان کے حق میں برکت کی طلب کرے۔ اولاد کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے کہ طبی اسباب و علاج کے ساتھ دعا کی جائے اور اولاد کی صالحیت کی تربیت اسی دن سے نیت میں شامل رہے۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ دعا کے اثرات کبھی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں، کبھی آخرت کے ذخیرے میں محفوظ رہتے ہیں اور کبھی کسی مصیبت کے ٹلنے کی صورت میں ملتے ہیں، چنانچہ قبولیت کی ظاہری شکل نہ دیکھ کر دعا چھوڑ دینا مناسب نہیں۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا و قبولیت کا واقعہ دعا کے آداب، امید کی طاقت اور اللہ کی بے پایاں قدرت کا جامع سبق ہے۔ خلوت میں آہستہ پکار، کمزوری کا اعتراف، دینی مقصدیت، صبر و استمرار اور قبولیت پر شکر اس واقعے کے وہ اسباق ہیں جو ہر مومن کی زندگی بدل سکتے ہیں۔ اس واقعے کا پیغام سادہ مگر گہرا ہے کہ بڑھاپا ہو یا بانجھ پن، بیماری ہو یا بے روزگاری، جب سارے دروازے بند نظر آئیں تو دعا کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ طالب علم کے لیے سب سے قیمتی حاصل یہی یقین ہے کہ وہ اپنے رب سے مانگنے میں کبھی ہچکچائے نہیں، کیونکہ زکریا علیہ السلام کی طرح مخلص دعا کبھی خالی نہیں لوٹتی۔

سوال نمبر 3: واقعہ مباہلہ کا پس منظر اور اس کے نتائج (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ واقعہ مباہلہ کا پس منظر اور اس کے نتائج بیان کریں۔ (20)

تعارف

واقعہ مباہلہ سیرتِ نبوی کے ان واقعات میں سے ہے جو اسلام اور عیسائیت کے بنیادی عقیدے کے بنیادی اختلاف، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت، کے فیصلے کے لیے پیش آیا۔ یہ واقعہ سورۃ آلِ عمران (آیات 59 تا 63) سے متعلق ہے اور اس کا زمانہ عام طور پر 9 یا 10 ہجری بیان کیا جاتا ہے جب یمن کے علاقے نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ مباہلہ کے معنی باہم لعنت و بد عا کی اس صورت کے ہیں جس میں دو فریق اپنے اہل و عیال کے ساتھ میدان میں آ کر اللہ سے عرض کرتے ہیں کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہو (آیت 61 کا مفہوم)۔ یہ انتہائی درجے کا فیصلہ ہوتا ہے جو بحث و دلیل کے تمام مراحل طے ہونے کے بعد ہی اختیار کیا جاتا ہے۔ اسلام نے مکالمے، دلیل اور پھر آخری مرحلے میں مباہلے کی یہ ترتیب دے کر دینی مناظرے کے آداب بھی سکھا دیے ہیں۔ اس جواب میں پہلے نجران کے وفد کا پس منظر، پھر مباہلے کی دعوت و کیفیت اور آخر میں اس کے نتائج و اسباق بیان کیے جائیں گے، اور بین المذاہب احترام کے دائرے میں رہتے ہوئے گفتگو صرف تعلیمی و تاریخی رہے گی۔

پس منظر: نجران کا وفد اور بحث کا موضوع

نجران یمن کا ایک سرسبز علاقہ تھا جہاں عیسائی مذہب کا بڑا مرکز قائم تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی خطوط کے بعد نجران کے سرداروں و علماء کا ایک وفد مدینہ آیا جس میں ان کے مذہبی و سیاسی رہنما شامل تھے۔ وفد نے مسجدِ نبوی میں قیام بھی کیا اور اپنی عبادت کی اجازت بھی پائی، جو مدینہ کے بین المذاہب رواداری کے ماحول کی دلیل ہے۔ گفتگو کا اصل محور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش و مرتبے کا سوال تھا: عیسائی علماء انہیں الوہیت کی طرف منسوب کرتے تھے اور باپ کے بغیر پیدائش کو اس کی دلیل بتاتے تھے۔ اس پر سورۃ آلِ عمران میں جواب نازل ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی سی ہے، انہیں مٹی سے پیدا کیا پھر "کن" فرمایا تو وہ ہو گئے (آیت

59 کا مفہوم)، یعنی جب آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے پیدا ہو سکتے ہیں تو عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا اللہ کی قدرت سے کوئی بعید بات نہیں، اور اس سے ان کی الوہیت لازم نہیں آتی۔ دلیلوں کا یہ سلسلہ کئی نشستوں تک چلا اور حق واضح ہو گیا۔

مباہلے کی دعوت اور اس کی کیفیت

جب عقلی و نقلی دلائل کے بعد بھی وفد اپنے موقف پر قائم رہا تو آیتِ مباہلہ نازل ہوئی جس کے مفہوم کے مطابق حکم ہوا کہ جو شخص علم آ جانے کے بعد بھی اس معاملے میں جھگڑے تو کہا جائے کہ آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو، اور اپنی جانوں کو اور تمہاری جانوں کو بلائیں، پھر گڑگڑا کر دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں (سورۃ آلِ عمران، آیت 61)۔ مقررہ دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہلِ بیت کے منتخب افراد کو لے کر تشریف لائے، روایات میں حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے نام آتے ہیں۔ وفد کے لوگوں نے جب یہ پُروقار کیفیت دیکھی تو باہم مشورہ کیا اور ان کے ایک بڑے عالم نے خبردار کیا کہ ان چہروں کی دعا پہاڑوں کو بھی ہلا سکتی ہے، چنانچہ مباہلے سے باز رہنا ہی دانشمندی ہے۔ یوں وفد نے مباہلے سے انکار کر دیا اور جزیہ دے کر اسلام کی سرپرستی میں اپنے مذہب پر رہنے کا معاہدہ قبول کر لیا۔ یہ کیفیت خود اس بات کی عملی دلیل بن گئی کہ وفد دلی طور پر حق کو پہچان چکا تھا مگر دنیاوی مفادات آڑے آئے۔

نتائج (1): حق کی فتح اور دعوت کا وقار

اس واقعے کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ بغیر جنگ و جدل کے حق کی برتری ثابت ہو گئی۔ طالب علم کے لیے یہ نکتہ اہم ہے کہ اسلام کا فیصلہ میدانِ دلیل میں ہوا، اور مباہلے کی پیشکش بھی مخالف کی ضد کے آخری مرحلے پر آئی، جلدی بازی یا طاقت کے زور پر نہیں۔ دوسرا نتیجہ نجران کے عیسائیوں سے جزیہ کا معاہدہ ہے جس کے تحت وہ اپنے مذہب، گرجوں اور جان و مال کی حفاظت کے بدلے ریاست کو مقررہ رقم دیتے رہے، اور یہ معاہدہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کے اصول کی عملی مثال بن گیا۔ بعد میں نجران کے لوگوں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے امین شخصیت کی درخواست کی جس پر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ بھیجا گیا، یہ اس باہمی اعتماد کی علامت ہے جو اس معاملے کے بعد قائم ہوا۔ یوں واقعے کا نتیجہ صرف ایک بحث کی جیت نہیں تھا بلکہ ایک پرامن سیاسی و سماجی تصفیے کی صورت میں سامنے آیا۔

نتائج (2): علمی و دینی اسباق

اس واقعے سے کئی اسباق ملتے ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ دینی گفتگو کی ترتیب علم و دلیل سے شروع ہوتی ہے اور انتہائی قدم اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب ضد باقی رہ جائے، عام زندگی میں مباہلے جیسی صورتیں اہلِ علم کی راہ نمائی کے بغیر اختیار کرنا درست نہیں۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ اہلِ بیت کی فضیلت کا ایک پہلو اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نازک موقع پر اپنے انہی پیاروں کو چنا جنہیں آیت میں "ہمارے بیٹے، ہماری عورتیں اور ہماری جانیں" کے الفاظ کے مصداق قرار دیا جاتا ہے۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ سچائی کے ساتھ کھڑا انسان تعداد و اسباب کے مقابلے میں یقین کی قوت سے سرشار ہوتا ہے؛ مدینہ کی چھوٹی سی جماعت کے سامنے ایک بڑے مذہبی وفد کا پیچھے ہٹنا اسی یقین کا ثبوت تھا۔ چوتھا سبق رواداری کا ہے کہ بحث کی شدت کے باوجود وفد کو مسجد میں عبادت کی کھلی چھٹی ملی اور مکالمے کا احترام اور آخر میں حقوق کا مکمل تحفظ ملا، جو آج کے بین المذاہب مکالمے کے لیے نمونہ ہے۔ پانچواں سبق یہ ہے کہ دنیاوی مفاد اور عہدوں کی محبت بعض اوقات انسان کو سچائے ہوئے حق کے قبول سے روک دیتی ہے، جیسا کہ وفد کے بعض رہنماؤں کے بارے میں روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

واقعے کی تاریخی و تنظیمی اہمیت

تاریخی اعتبار سے واقعہ مباہلہ جزیرۂ عرب میں اسلام کی فکری قیادت کے قائم ہونے کا اعلان تھا۔ نجران عیسائیت کا مستحکم قلعہ سمجھا جاتا تھا، اس کے علماء کا مباہلے سے رجوع گویا اس قلعے کی فکری سرنگوں کا واقعہ تھا، جس کے بعد عرب کے مختلف قبائل کی وفد آمد کا سلسلہ مزید تیز ہو گیا اور 9 ہجری کو وفود کا سال کہا جانے لگا۔ تنظیمی اعتبار سے جزیے کا نظام، اہلِ کتاب سے معاہدات اور غیر مسلم شہریوں کے حقوق کی دستاویزات اسی ماحول میں پروان چڑھیں۔ اس واقعے نے یہ اصول بھی قائم کر دیا کہ اسلامی ریاست میں عقیدے کا فیصلہ جبر سے نہیں ہوتا، تبلیغ و دلیل کا میدان کھلا رہتا ہے اور شہری حقوق معاہدے سے طے ہوتے ہیں۔ مطالعہ قرآن کے طالب علم کے لیے سورۃ آلِ عمران کی ان آیات کا سیاق اسی واقعے سے سمجھنا سب سے بہتر طریقہ ہے، کیونکہ آیات کا نزول کسی جیت یا ہار کے لیے نہیں بلکہ توحید کی اس بنیاد کی وضاحت کے لیے ہوا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے و رسول ہیں، معبود نہیں۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ مباہلہ کا پس منظر نجران کے عیسائی وفد کی مدینہ آمد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام پر بحث سے تعلق رکھتا ہے، دلائل کے بعد آیتِ مباہلہ نازل ہوئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ بیت سمیت تشریف لائے تو وفد نے مشورے کے بعد مباہلے سے رجوع کر کے جزیے کا معاہدہ قبول کیا۔ اس کے نتائج میں حق کی دلیل کی بنیاد پر برتری، اہلِ کتاب کے ساتھ پرامن معاہدہ، اہلِ بیت کی فضیلت کا ظہور اور [illegible] کی دعوت میں حوصلے و حکمت کا نمونہ شامل ہیں۔ آج کے لیے سبق یہی ہے کہ دینی گفتگو علم، ادب اور صبر سے کی جائے، اختلاف کی صورت میں بھی انصاف و رواداری کا دامن نہ چھوڑا جائے، اور کسی بھی دینی معاملے کی قطعی صورتوں میں اہلِ علم کا سہارا لیا جائے۔ یہی اس واقعے کا وہ متوازن پیغام ہے جو اسے سیرت کے یادگار ابواب میں رکھتا ہے۔

سوال نمبر 4: "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا" اور اجتماعی استحکام کے اصول (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا" کی روشنی میں اجتماعی استحکام کے اصول بیان کریں۔ (20)

تعارف

سورۃ آلِ عمران کی آیت 103 میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا ہے کہ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ نہ ڈالو (آیت کا مفہوم)۔ اس ایک جملے میں اجتماعی زندگی کا پورا فلسفہ سمو دیا گیا ہے کہ کسی بھی قوم کی بقا اس کے اتفاق میں ہے اور اس کی تباہی کا سب سے تیز راستہ انتشار ہے۔ آیت کے سیاق میں مدینہ کے اوس و خزرج قبائل کا ذکر بھی آتا ہے کہ وہ آپس میں دشمن تھے، اللہ نے دلوں میں الفت ڈال دی اور وہ اس نعمت سے بھائی بن گئے، اور وہ آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اللہ نے انہیں بچا لیا (آیت 103 کے آخری حصے کا مفہوم)۔ یہ پس منظر بتاتا ہے کہ اتحاد کوئی نعرہ نہیں بلکہ الٰہی نعمت ہے جس کی قدر و حفاظت لازمی ہے۔ موجودہ دور میں فرقہ واریت، لسانی تقسیم اور سماجی نفرتوں نے امتِ مسلمہ کی طاقت کو پارہ پارہ کیا ہوا ہے، اس لیے یہ آیت آج پہلے سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔ اس جواب میں پہلے "حبل اللہ" کے مفہوم، پھر اجتماعی استحکام کے اصول اور آخر میں تفرقے کے نقصانات و عملی تدابیر بیان کی جائیں گی۔

"حبل اللہ" کا مفہوم

حبل کے معنی رسی کے ہیں، اور "حبل اللہ" سے مفسرین کی غالب رائے کے مطابق مراد اللہ کا دین، اس کی کتاب قرآن حکیم اور اس سے جڑا ہوا وہ عہد ہے جو بندے کو اللہ سے جوڑتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے جماعت اور اتفاق کو بھی مراد لیا ہے کیونکہ کتاب سے تمسک کا لازمی نتیجہ جماعت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ رسی کی تمثیل نہایت موزوں ہے کہ جیسے گڑھے میں گرا ہوا شخص رسی کو پکڑ کر نکلتا ہے، ویسے ہی انسانیت اپنے کے گڑھے سے قرآن کو تھام کر نکل سکتی ہے، اور جیسے رسی کے تمام ریشے مل کر اسے مضبوط بناتے ہیں، ویسے ہی تمام مسلمان مل کر اس رسی کو مضبوط بناتے ہیں۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ رسی دونوں طرف سے جڑی ہوتی ہے: ایک سرا اللہ کی طرف، دوسرا بندوں کے ہاتھ میں، گویا اتحاد محض سماجی انتظام نہیں بلکہ اللہ سے تعلق کی اجتماعی صورت ہے۔ اس لیے جو اتحاد اللہ کی کتاب سے باہر قائم ہو وہ وقتی ہو سکتا ہے، مستحکم نہیں ہو سکتا، کیونکہ مفادات بدلتے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

اجتماعی استحکام کا اصول (1): واحد مرکزِ مرجع

پہلا اصول یہ ہے کہ اجتماعی استحکام کے لیے واحد مرجع ضروری ہے۔ مسلمانوں کا مرجع قرآن و سنت ہے، یعنی اختلاف کی صورت میں فیصلہ شخصی خواہش، قبیلے کی عصبیت یا طاقتور کی رائے سے نہیں بلکہ اسی رسی کے احکام سے ہو گا۔ سورۃ النساء (آیت 59) کے مفہوم میں بھی نزاع کی صورت میں معاملہ اللہ و رسول کی طرف لوٹانے کا حکم ہے۔ اس اصول کا فائدہ یہ ہے کہ قوم میں اساسیات پر اتفاق رہتا ہے اور فروعی اختلافات جنگ و جدل کا رنگ نہیں لیتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی امت کا مرکزی مرجع کمزور ہوا تو ہر گروہ نے اپنی رائے کو دین بنا لیا اور انتشار پیدا ہو گیا۔ اس کے برعکس خلافتِ راشدہ کے دور میں مرکز کی مضبوطی نے اوس و خزرج جیسے قدیم دشمنوں کو ایک نظام میں سمیٹ دیا۔ آج بھی گھریلو، ادارتی یا ملی زندگی میں یہی اصول بروئے کار آتا ہے کہ متفقہ بنیادیں واضح ہوں اور فیصلے انہی کی روشنی میں ہوں۔

اجتماعی استحکام کا اصول (2): اخوت و قلبی الفت

دوسرا اصول اخوت ہے۔ قرآن نے مومنوں کو بھائی قرار دیا ہے (سورۃ الحجرات، آیت 10 کا مفہوم) اور آیت اعتصام ہی میں بتایا کہ الفت دلوں میں اللہ نے ڈالی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استحکام صرف قوانین سے نہیں بلکہ دلوں کے جڑنے سے آتا ہے۔ اخوت کے تقاضے ہیں کہ مسلمان دوسرے مسلمان کی غیبت، حسد، بغض اور تحقیر سے بچے، کیونکہ یہی رویے تفرقے کی جڑ ہیں، جیسا کہ سورۃ الحجرات کی اگلی آیات میں ان آفات کی مذمت آئی ہے۔ خوشی و غم میں شرکت، کمزور کا ساتھ، مصیبت میں مدد اور معافی و درگزر کا جذبہ اخوت کو عملی شکل دیتا ہے۔ معاشرتی استحکام کا یہ اصول اتنا اہم ہے کہ نماز و زکاۃ جیسی عبادات بھی جماعت و اخوت کی تربیت کرتی ہیں: صف بندی میں مساوات، مسجد میں اجتماع اور زکاۃ میں ایثار اسی قلبی وحدت کے مظاہر ہیں۔ جہاں دلوں میں نفرت ہو وہاں بہترین دستور بھی استحکام نہیں لا سکتا، اور جہاں دل جڑے ہوں وہاں معمولی انتظامات بھی کافی ہو جاتے ہیں۔

اجتماعی استحکام کا اصول (3): تفرقے کی ممانعت اور اختلاف کا ادب

تیسرا اصول تفرقے کی ممانعت ہے۔ اسی آیت میں "وَلَا تَفَرَّقُوا" کہہ کر انتشار سے واضح روک لگائی گئی ہے اور سورۃ الانعام (آیت 159) و سورۃ الشوریٰ کے مفاہیم میں بھی دین میں گروہ بندی کی مذمت آئی ہے۔ یہاں نکتہ یہ ہے کہ اسلام نے ہر اختلاف کو تفرقہ قرار نہیں دیا؛ علمی و فروعی اختلاف صحابہ کے دور سے چلا آ رہا ہے اور یہ صحت کی علامت بھی ہو سکتا ہے، مگر جب اختلاف نفرت، تکفیر، قتل و غارت اور جماعت کو پاش پاش کرنے کی شکل اختیار کر لے تو وہ ممنوع تفرقہ بن جاتا ہے۔ اختلاف کے ادب کا اصول یہ ہے کہ بات دلیل سے ہو، مخالف کی نیت پر حملہ نہ ہو، شخصیات کے احترام کا خیال رہے اور مشترکہ بنیادوں کی حفاظت سب پر مقدم ہو۔ اسی اصول کے تحت مسلمان معاشرے میں صلح کی تحریک کو قرآن نے خیر کہا ہے اور دو ناراض گروہوں کے درمیان عدل سے صلح کرانا ایمان والوں کا فریضہ بتایا ہے (سورۃ الحجرات، آیت 9 تا 10 کا مفہوم)۔

جدول 1: استحکام بخش عوامل بمقابلہ انتشار پھیلانے والے عوامل

استحکام کے عوامل	انتشار کے عوامل
قرآن وسنت بطور مشترک مرجع	شخصیت پرستی و گروہی عصبیت
اخوت، ایثار اور درگزر	غیبت، حسد، بغض اور بدگمانی
شوراومشاورت سے فیصلے	انا، ضد اور فوری ردعمل
عدل اور حقوق کی ادائیگی	ظلم، استحقاق کی پامالی اور سفارش

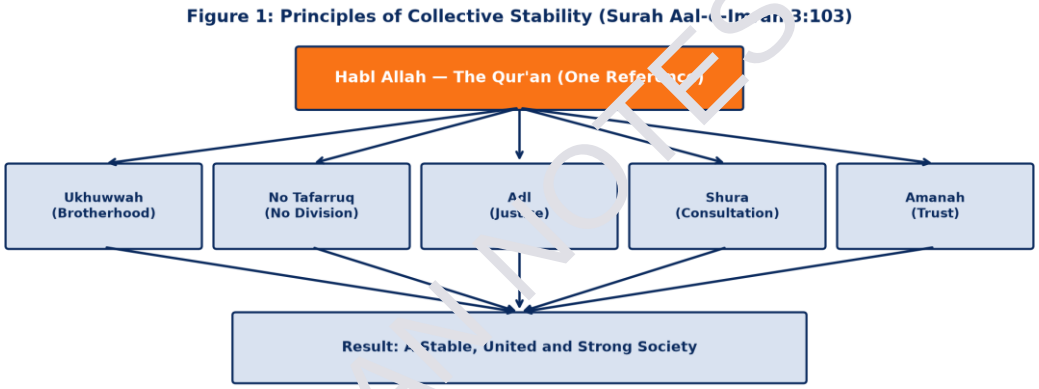
اجتماعی استحکام کا اصول (4): عدل، شورا اور امانت

چوتھا اصول عدل و شورا اور امانت کا ہے۔ مستحکم معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں اقتدار و ذمہ داری اہلیت کی بنیاد پر ملے، فیصلے مشاورت سے ہوں اور ہر طبقے کو اس کا حق ملے۔ قرآن نے امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کرنے اور لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے (سورۃ النساء، آیت 58 کا مفہوم) اور شوریٰ کو اہل ایمان کی صفت قرار دیا ہے (سورۃ الشوریٰ، آیت 38 کا مفہوم)۔ ظلم سب سے بڑا انتشار انگیز عامل ہے، کیونکہ مظلوم کا دل نظام سے اٹھ جاتا ہے اور پھر بغاوت و فساد کے بیج بوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جہاں عدل ہو وہاں دشمن بھی نظام کا احترام کرتا ہے۔ گھر سے لے کر ریاست تک یہ اصول یکساں ہے کہ خاندان کا سربراہ مشورہ کرے، ادارے کا ذمہ دار میرٹ رکھے اور ریاست قانون کی مساوات قائم کرے، یہی وہ ستون ہیں جن پر اجتماعی استحکام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

تفرقے کے نقصانات اور عملی تدابیر

تفرقے کے نقصانات قرآن و تاریخ دونوں نے واضح کر دیے ہیں۔ سورۃ الانفال (آیت 46) کے مفہوم میں تنازع کا انجام فشل (ناکامی) اور ہوا کے نکل جانے یعنی قوت و دبدبے کے خاتمے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ داخلی انتشار سے معیشت تباہ ہوتی ہے، بیرونی قوتیں مداخلت کا موقع پاتی ہیں، نسلیں نفرت کی فضا میں پروان چڑھتی ہیں اور دین کی بدنامی الگ ہوتی ہے۔ اس سے بچاؤ کی عملی تدابیر یہ ہیں: بنیادی عقائد و مشترکہ مقاصد پر اجتماع کو فروغ دینا، مسلکی و گروہی اختلاف کو علمی حدود میں رکھنا، سوشل میڈیا پر نفرت

انگیز مواد کی تشہیر سے اجتناب، علما و اہلِ خیر کی مصالحتی کوششوں کی قدر کرنا، نوجوان نسل کو قرآن سے براہِ راست جوڑنا تاکہ ان کا مرکز مشترک ہو، اور ہر سطح پر صبر و برداشت کو اجتماعی مزاج بنانا۔ ان تدابیر کا حاصل یہ ہے کہ امت اپنی توانائی بیرونی مسائل و داخلی تعمیر میں لگائے، باہمی الجھاؤں میں ضائع نہ کرے۔



شکل 1: اجتماعی استحکام کے اصول — حبل اللہ کی روشنی میں (سورۃ آلِ عمران، آیت 103)۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا" اجتماعی استحکام کا مکمل منشور ہے: اللہ کی رسی یعنی قرآن و دین کو سب مل کر تھامو، اس سے واحد مرجع ملے گا؛ دلوں میں اخوت و الفت پیدا کرو، اس سے قلبی وحدت آئے گی؛ تفرقے سے بچو اور اختلاف کو ادب میں رکھو، اس سے انتشار رکے گا؛ اور عدل، شورا و امانت کو اپناؤ، اس سے نظام میں اعتماد پیدا ہو گا۔ اوس و خزرج کی دشمنی کا اخوت میں بدلنا اس منشور کی تاریخی شہادت ہے اور آج کی منتشر امت کے لیے بھی علاج یہی ہے کہ وہ اسی رسی کو پھر سے مضبوطی سے تھام لے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ اس کی گفتگو، تحریر اور سوشل زندگی اتحاد بڑھانے والی ہو، انتشار پھیلانے والی نہ ہو، یہی اجتماعی استحکام میں اس کا حصہ ہے۔

سوال نمبر 5: امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت اور معاشرتی اثرات (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت اور اس کے معاشرتی اثرات پر تفصیلی گفتگو کریں۔ (20)

تعارف

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مطلب ہے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ یہ وہ عظیم فریضہ ہے جس پر کسی معاشرے کی اخلاقی صحت کا دارومدار ہے۔ قرآن حکیم نے اس امت کی فضیلت ہی اس فریضے سے وابستہ کی ہے کہ تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو (سورۃ آلِ عمران، آیت 110 کا مفہوم)۔ اسی سورت کی آیت 104 میں ایک جماعت کے اس کام میں مخصوص طور پر مصروف رہنے کی ہدایت بھی ہے۔ اس فریضے کی ضرورت اس لیے ہے کہ برائی فطرتاً پھیلتی ہے اور نیکی کو حفاظت چاہیے ہوتی ہے؛ اگر نیک لوگ خاموش رہ جائیں تو برائی کو میدان خالی ملتا ہے اور رفتہ رفتہ پورا معاشرہ اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اس جواب میں پہلے اس فریضے کی شرعی اہمیت، اس کے درجات و شرائط، پھر اس کے معاشرتی اثرات اور آخر میں عصرِ حاضر میں اس کی عملی صورتوں پر گفتگو کی جائے گی، اس اصولی تنبیہ کے ساتھ کہ قانون کا نفاذ ریاست و عدالت کا کام ہے اور فرد کا دائرہ نصیحت، کردار اور پرامن آواز تک محدود ہے۔

شرعی اہمیت و بنیادیں

اس فریضے کو قرآن نے نماز و زکاۃ کے ساتھ جوڑ کر ذکر کیا ہے کہ اہلِ ایمان زمین میں اقتدار پائیں تو نماز قائم کرتے ہیں، زکاۃ دیتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں (سورۃ الحج، آیت 41 کا مفہوم)۔ سورۃ التوبہ (آیت 71) میں مومن مردوں و عورتوں کو ایک دوسرے کا ولی و مددگار قرار دے کر انہی اوصاف کو ان کی پہچان بتایا گیا ہے، جبکہ منافقین کی پہچان اس کے برعکس بیان ہوئی کہ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں (آیت 67 کا مفہوم)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ کوئی اختیاری خیر خواہی نہیں بلکہ ایمانی شناخت کا حصہ ہے۔ اس کی ایک بڑی بنیاد یہ بھی ہے کہ پچھلی امتوں کی تباہی کا ایک سبب یہ بیان ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو برائی سے نہیں روکتے تھے (سورۃ المائدہ، آیات 78 تا 79 کا مفہوم)، اور بنی اسرائیل کے قصص میں سبت والوں کے واقعے میں بچنے والے وہی تھے جو روکنے میں مصروف تھے (سورۃ الاعراف، آیات 164 تا 165 کا مفہوم)۔ گویا یہ فریضہ اجتماعی نجات کی شرط ہے، کیونکہ عذاب و تباہی جب آتی ہے تو صرف ظالموں تک محدود نہیں رہتی (سورۃ الانفال، آیت 25 کا مفہوم)۔

اس فریضے کے درجات، شرائط و آداب

اس فریضے کے درجات استطاعت کے مطابق ہیں: جس کے اختیار میں عملی روک تھام ہو (مثلاً والدین اپنے گھر میں، منتظم اپنے ادارے میں، ریاست اپنے دائرے میں) وہ وہاں ذمہ دار ہے؛ عام فرد کا اصل ذریعہ زبان سے نرمی و حکمت کے ساتھ سمجھانا ہے؛ اور کم از کم درجہ یہ ہے کہ دل میں برائی کو برا سمجھا جائے اور اس سے لاتعلقی رکھی جائے، جو ایمان کا کمزور ترین مگر آخری درجہ ہے (مشہور حدیث کا مفہوم، صحیح مسلم)۔ اس کی شرائط میں سب سے پہلے علم ہے کہ جس چیز کا حکم دیا جا رہا ہے وہ واقعی شریعت میں معروف ہو اور جس سے روکا جا رہا ہے وہ واقعی منکر ہو، اندازے و سنی سنائی پر کسی کو ملامت کرنا درست نہیں۔ دوسری شرط نرمی و حکمت ہے کہ نصیحت اکیلے میں، شفقت سے اور موقع کی مناسبت سے ہو، کیونکہ سرِ بازار رسوا کرنا اکثر اصلاح کے بجائے ضد پیدا کرتا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ خود نصیحت کرنے والا اپنے کہے پر عمل کرنے والا ہو، ورنہ بات اثر کھو دیتی ہے جیسا کہ قرآن نے اس دوہرے معیار پر سخت وعید سنائی ہے (سورۃ البقرہ، آیت 44 اور سورۃ الصف، آیت 2 تا 3 کا مفہوم)۔ چوتھی شرط صبر ہے کہ برائی روکنے میں پیش آنے والی ناراضی و تکلیف برداشت کی جائے، جیسا کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو اس فریضے کے ساتھ صبر کی بھی وصیت کی (سورۃ لقمان، آیت 17 کا مفہوم)۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ روکنے سے بڑی برائی پیدا نہ ہو رہی ہو، ایسی صورت میں حکمت و ماہر اہلِ علم کی راہ نمائی لازم ہے۔

معاشرتی اثرات (1): اخلاقی صحت اور جرائم کی روک تھام

اس فریضے کا پہلا بڑا معاشرتی اثر یہ ہے کہ یہ معاشرے کا غیر رسمی مگر مستقل احتسابی نظام ہے۔ قانون صرف اس جرم کو پکڑتا ہے جو ثابت ہو جائے، مگر سماجی آواز ہر اس برائی کو ابتدا ہی میں شرم و لحاظ کے دباؤ سے روکتی ہے جو بڑھ کر جرم بن سکتی ہے۔ جس محلے میں جھوٹ، ملاوٹ، رشوت، نشہ آور اشیا اور بدامنی پر بولو مٹھی کھلتی ہو یعنی لوگ خاموش نہ رہیں بلکہ پرامن آواز اٹھائیں، وہاں برے عناصر کو قدم جمانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں "میرا کیا لینا دینا" کی ثقافت آ جائے وہاں برائی پیشہ وروں کا راج ہو جاتا ہے۔ دوسرا اثر اخلاقی فضا کی حفاظت ہے: نوجوان نسل کی تربیت صرف نصابی کتابوں سے نہیں بلکہ ماحول سے ہوتی ہے، اور یہی فریضہ ماحول کو پاکیزہ رکھتا ہے۔ تیسرا اثر یہ ہے

کہ کمزور و مظلوم کو سہارا ملتا ہے کہ ظالم کے خلاف آواز اٹھانے والے موجود ہیں، جس سے معاشرے میں اعتماد و تحفظ کا احساس بڑھتا ہے۔ ان اثرات کی وجہ سے ترقی یافتہ معاشرے بھی قانون کے ساتھ ساتھ سماجی احتساب (سول سوسائٹی کی آواز، میڈیا اور کمیونٹی نگرانی) کو اہمیت دیتے ہیں، جو اس قرآنی فریضے کی عصری شکل سے ملتا جلتا ہے۔

معاشرتی اثرات (2): اجتماعی شعور، قیادت کی اصلاح اور الٰہی نصرت

اس فریضے کے مزید اثرات یہ ہیں کہ اس سے اجتماعی شعور بیدار رہتا ہے اور قومیں اخلاقی جمود کا شکار نہیں ہوتیں؛ حکمران و اہلِ اثر کو آئینہ دکھانے والا طبقہ موجود رہے تو طاقت کا غلط استعمال کم ہو جاتا ہے، اور یہی وہ اصول ہے جسے جدید اصطلاح میں احتساب و شفافیت کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ فریضہ معاشرے میں نیکی کو فیشن و رجحان بناتا ہے: جب خیر خواہی، دیانت اور خدمت کی تعریف و حوصلہ افزائی ہوتی ہے تو نیکی کرنا آسان اور معزز عمل بن جاتا ہے، جسے آج کل مثبت کمک (مثبت رویے کی قدر افزائی) کہا جا سکتا ہے۔ دینی اعتبار سے اس فریضے کو الٰہی نصرت و برکت سے بھی جوڑا گیا ہے کہ جس معاشرے میں نیکی کی آواز زندہ ہو وہاں رحمت کے دروازے کھلتے ہیں اور عذاب و تباہی کے اسباب دور ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ یہ فریضہ مومن کو تماشائی بننے سے بچاتا ہے اور اسے ذمہ دار شہری بناتا ہے، کیونکہ اس کی نگاہ میں ہر برائی اس کی اپنی ذمہ داری کا سوال ہے۔

جدول 1: فریضہ امر بالمعروف کی موجودگی و عدم موجودگی کے اثرات

پہلو	فریضہ موجود ہو تو	فریضہ چھوٹ جائے تو
اخلاقی فضا	نیکی معزز، برائی شرمناک	برائی معمول، نیکی اجنبی
جرائم	ابتدا ہی میں سماجی روک	جرائم پیشہ عناصر بے خوف
قیادت	احتساب سے اصلاح	طاقت کا بے لگام استعمال
نوجوان نسل	پاکیزہ ماحول میں تربیت	ماحول کی آلودگی سے متاثر

عصرِ حاضر میں عملی صورتیں اور حدود

آج اس فریضے کی پر امن و قانونی صورتیں مندرجہ ذیل ہیں: گھر میں والدین کی محبت بھری تربیت؛ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی کردار سازی؛ مسجد و خطبے میں حکمت سے اصلاحی گفتگو؛ میڈیا و سوشل میڈیا پر مثبت مہمات اور غلط معلومات کی درستی؛ بازار میں ملاوٹ و دھوکے کے خلاف صارفین کی منظم آواز؛ اور ریاستی سطح پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کا آئینی کردار۔ اس کے ساتھ حدود کا خیال رکھنا بھی فرض ہے: کسی فرد کو خود سزا دینا، پر تشدد ہونا، کسی کی عزت اچھالنا یا قانون ہاتھ میں لینا اس فریضے کا حصہ نہیں بلکہ خود ایک منکر ہے جس سے روکنا ضروری ہے۔ مختلف فیہ شرعی مسائل میں شدت کے بجائے اہلِ علم کی طرف رجوع کیا جائے اور غیر مسلم شہریوں کے ساتھ بھی یہ معاملہ دعوت و اخلاق کے دائرے میں رہے، جبر کے دائرے میں نہیں۔ اس طرح یہ فریضہ فساد کا ذریعہ بننے کے بجائے امن و اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے۔

خاتمہ

خلاصہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امتِ مسلمہ کی فضیلت کی بنیاد، اجتماعی نجات کی شرط اور معاشرتی صحت کا محافظ نظام ہے۔ علم، عمل، نرمی و حکمت اور صبر اس کے اوزار ہیں اور اس کے اثرات اخلاق کی حفاظت، جرائم کی روک تھام، قیادت کے احتساب اور نوجوان نسل کی تربیت تک پھیلے ہیں۔ جو معاشرہ اس فریضے کو چھوڑ دیتا ہے وہ خاموشی سے اپنی تباہی کی دستاویز پر دستخط کر دیتا ہے، اور جو اسے حکمت سے زندہ رکھتا ہے وہ دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ہوتا ہے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے آغاز کرے: خود نیکی پر عمل کرے، اپنے دائرے میں محبت سے نصیحت کرے اور برائی سے کم از کم دل کی سطح پر نفرت ضرور رکھے، کیونکہ اصلاح کا سفر ہمیشہ اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے۔